محمد حنیف ندوی

تاثرات

مجلسِ مذاکرہ اور مسئلہ اجتہاد کی اہمیّتیں

۲۹ دسمبر سے لاہور میں اسلامی مجلسِ مذاکرہ کا اجلاس شروع ہو رہا ہے، دس دن تک اس کی شمیم انگیزیوں سے اہلِ فکر و ذوق بہرہ مند ہوتے رہیں گے۔ تقریباً ساٹھ ستّر کے لگ بھگ مقالے پڑھے جائیں گے۔ مصر، شام اور سعودی عرب سے مسلمان فضلاء کی اچھی خاصی جماعت آ رہی ہے۔ مستشرقین میں سے بھی کئی حضرات کے آنے کی اطلاع ہے۔ خدا کرے اس بین الاقوامی مجلس بحث و فکر کی بدولت یہاں کا علمی جمود کسی طرح رفع ہو، اور ہمارے علماء بھی سنجیدگی سے فقہ و معاشرہ کے صحت مند پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کریں۔

موضوعِ بحث خصوصیّت سے دو چیزیں ہیں:

(۱) موجودہ نظریات اور اجتماعی اقدار نے اسلامی معاشرہ کو جو چیلنج کیا ہے، اس کو کہاں تک قبول کیا جا سکتا ہے؟

(۲) اجتہاد کے دائرہ کار کی وسعتیں کہاں سے کہاں تک وسیع ہیں؟

یہ دونوں بحثیں کس درجہ اہم، دلچسپ اور نازک ہیں اس سے کون شخص آگاہ نہیں ہے؟ اس لئے قدرتاً ہر کوئی چاہیگا کہ ان پر چیدہ چیدہ اہلِ علم کی رائے معلوم کرے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بظاہر اگرچہ یہ دو الگ الگ سوال ہیں، اور دو علیٰحدہ اور مستقل بالذات بحثیں ہیں۔ مگر درحقیقت یہ ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ اگر اجتہاد کا دائرہ کار واضح ہو جاتا ہے، اس کی حدود متعین ہو جاتی ہیں اور یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ فکر و قیاس کی عقدہ کشائیاں کس حد تک ارتقاء و تغیّر کی تیز رفتاریوں کا ساتھ دے سکتی ہیں تو پھر یہ مسئلہ قطعی دشوار نہیں رہتا کہ موجودہ نظریات و افکار اور اجتماعی اقدار کی روشنی میں اسلامی معاشرہ کیونکر موجودہ تحدیات کو قبول کر سکتا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ یہی بحث ابہام کی نذر ہو جاتی ہے اور مقالے اس سے زیادہ روشنی ہم نہیں پہنچاتے، کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے، اور ہمارے فقہاء نے اس کی ضرورت کو تسلیم کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا، اس کی یہ یہ شرائط ہیں تو اس سے نفسِ موضوع کے بارہ میں جو تشنگی ہے وہ رفع نہیں ہو پاتی۔ اور بنا بریں اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ اسلامی معاشرہ میں موجودہ رجحانات کے مقابلہ میں کوئی جاندار موقف اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ہماری رائے میں زیادہ توجہ اسی سوال پر مرکوز رہنا چاہئے۔ بلکہ سب سے پہلے اسی موضوع پر اظہارِ خیال ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس اشکال سے نمٹے بغیر اور سوال کے اس مرکزی پہلو سے تعرض کئے بنا دوسرے موضوع کے بارے میں

ایک لفظ کہنا مشکل ہے ـــــ ہمیں اُمید ہے کہ فاضل مقالہ نگار دونوں موضوعوں میں سے چاہے جس موضوع پر اظہارِ خیال کریں، اس بنیادی نکتہ کی بہرحال وضاحت ضرور فرمائیں گے۔ اور قیاس واجتہاد کے دائرہ کار کی وسعتوں کا جو تعلق اسلامی معاشرہ کی تشکیل سے ہے اس کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے۔

آج پاکستان دوراہے پر کھڑا ہے۔ ایک طرف زندگی کا پورا ناڈھانچہ ہے جو فرسودہ ہو چکا ہے۔ اور موجودہ صورت میں جس کو اپنا ساتھ آگے بڑھنا اور ترقی کرنا ناممکن ہے۔ دوسری طرف بالکل ہی نئی زندگی اور تہذیب ہے، جس کو صنعتی اور سائنسی ارتقاء نے جنم دیا ہے۔ اور اس کے تقاضے ہیں جو قدیم اندازِ زیست پر قانع ہونے والے نہیں۔ بلکہ جو فقہ وقانون کے متعدد خانوں کو از سرِ نو تعمیر کرنے پر مصر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس مشکل پر کیونکر قابو پایا جائے، اور بحیثیت مسلمان ہونے کے اسلام اس سلسلہ میں ہماری کیا دستگیری کرتا ہے۔

مسئلہ زیر بحث میں اصل اُلجھن یہ ہے کہ زندگی اور مذہب میں ایک طرح کی بیگانگی مان لی گئی ہے۔ جہاں اوّل الذکر رواں دواں اور تغیر پذیر حقیقت کا نام ہے، وہاں ثانی الذکر کے متعلق یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ سراسر سکون، قرار اور جمود سے تعبیر ہے۔ علاوہ ازیں دونوں کے مزاج میں ایک فرق یہ پیدا ہو گیا ہے کہ زندگی اور اس کی تفصیلات کا مرکز تو زمین، انسان اور یہ معاشرہ ہے جو ہر وقت مصالح کے تحت بدل سکتا ہے، اور نئے نئے تغیرات کا آسانی سے خیر مقدم کر سکتا ہے۔ مگر مذہب کے باب میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی ہدایات کا منبع آسمان ہے اور اس میں انسان کی حیثیت بالکل ثانوی درجہ کی ہے۔ لہٰذا یہ مجبور ہے کہ بہرحال اس نقشہ کا پابند رہے جو آج سے صدیوں پہلے اس کے لئے دینی مستندات نے تجویز کر دیا ہے۔ اس میں ردوبدل، تغیر اور ارتقاء کی قطعی گنجائش پائی نہیں جاتی۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ہمارے فقہاء متاخرین نے زندگی اور مذہب کی اس تفریق کو مان لیا ہے یا ان کے اقوال سے کہیں اس تفریق کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن معاملات ومسائل پر غور کرتے وقت اُنہوں نے جو طریق اختیار کیا ہے اور نفسِ زندگی سے قطع نظر کر کے جو محض نصوص وآثار کا سہارا لیا ہے۔ اور خالص ذہنی اور روزمرہ کے واقعات ومسائل پر اس انداز میں جو سوچ بچار کیا ہے کہ وہ بھی گویا الہیات یا تعبدیات کے قبیل کی کوئی شئے ہے۔ اس سے اسی ذہنیت کی غمازی ہوتی ہے۔ حالانکہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہم پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان معنوں میں سرے سے مذہب ہی نہیں کہ جو زندگی کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہ کرتا ہو۔ یا انسانی ذہن وفکر کی قدر وقیمت گھٹاتا ہو اور اس کے بجا درجہ ومرتبہ کی نفی کرتا ہو۔

مذہب وزندگی میں یہ تفریق اسلام سے پہلے کے ذہن کی یادگار ہے۔ یہودیت نے مثلاً پہلے پہل ایسی بے روح اور ناقابلِ عمل فقہ پیش کی جس کا مدار خشک الفاظ پرستی پر تھا۔ اسی کو قرآن نے اغلال قرار دیا ہے۔ اس کے بعد عیسائیت آئی جو الفاظ پرستی اور جمود کے خلاف احتجاج کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اس لئے صرف فقہ اور قانون کے

جائز تقاضوں کا ہی انکار نہیں کیا، بلکہ شریعت سے بھی انحراف کیا۔ مگر آخر میں کلیسا نے یہودیت کا تتبع کرکے چھوڑا اور ایسے ایسے عجیب و غریب قوانین وضع کئے، جو اپنی غیر معقولیت میں کسی طرح بھی یہودیت سے کم نہ تھے۔

اسلام نے ان دونوں کے برعکس ایک دوسری ہی راہ اختیار کی۔ اس نے بتایا کہ زندگی بے شک متغیر ہے، ارتقاء پذیر ہے، اور آگے بڑھنے والی ہے۔ مگر اس کے باوجود ایک نوع کا تعین و قرار چاہتی ہے اور ثبات و استحکام کی طالب ہے۔ کہ اس کے بغیر کوئی پائیدار تہذیب اور شاندار ثقافت معرضِ ظہور میں نہیں آسکتی۔ اور یہ تعین و قرار اور ثبات و استحکام صرف مذہب کی پیروی اور اطاعت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس طرح مذہب کے مزاج میں گو ایک طرح کا ٹھیراؤ، استواری اور استحکام پایا جاتا ہے، جو تہذیبی اور اخلاقی پائیداری کے لئے نہایت ضروری ہے۔ لیکن تغیر و انقلاب کے حیات آفریں تقاضوں سے بھی صرفِ نظر ممکن نہیں کیونکہ اس کے بغیر مذہب بالکل بے جان، بے کیف اور ٹھس ہو کر رہ جائے گا۔ افسوس ہے کہ ہمارے فقہائے متاخرین نے مذہب و زندگی سے متعلق اس عظیم الشان حقیقت کو فراموش کر دیا، اور اسی سنہرے اصول کو چھوڑ دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہماری فقہ، موجودہ دور کے جاندار، زندہ اور متحرک نظام ہائے حیات کے مقابلہ میں اپنی برتری اور معقولیت ثابت نہیں کر سکتی۔ یہی نہیں بلکہ اس قدر فرسودہ اور بے کار ہے کہ اس پر اگر آج کے معاشرہ کی بنیاد رکھی جائے تو مسلمانوں کو عصرِ نو کی بہت سی نعمتوں سے دست بردار ہونا پڑے گا اور ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنا پڑے گی، کہ جس کو متمدن دنیا کا ماحول نہیں کہا جا سکتا۔

ہمیں یقین ہے کہ سمپوزیم میں شریک ہونے والے فاضل مقالہ نگار حضرات مسئلہ کے اس پہلو کو خوب سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ اجتہاد کی حدود اور دائرہ کار کی وضاحت و تعیین اس طور سے کرینگے کہ اسلام کی اس رعایت سے فی الواقع کوئی عملی فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ اور اس کی روشنی میں ایسی زندگی کی تشکیل کی جا سکے جو تغیر و ثبات کے دوگونہ تقاضوں کو لئے ہوئے ہو۔ یعنی جس میں ایک طرف تو اسلامی رجحان اور مزاج کی نمایاں جھلک ہو اور اسلامی روح اور اقدار کی واضح چاشنی پائی جائے اور دوسری طرف زندگی کا کوئی انقلاب اور صحت مند تبدیلی ایسی نہ ہو، کہ جس کو ہم اپنے معاشرہ میں سمو نہ سکیں اور جس سے کہ ہم کما حقہ فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔

ہم آئندہ اشاعتوں میں ان مقالوں پر مکمل تبصرہ کرینگے اور دیکھیں گے کہ کس نے کہاں تک اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔ انشاء اللہ

مطبوعات مجلس ترقیٔ ادب

صحیفہ۔ (سہ ماہی مجلّہ) مدیر سید عابد علی عابد۔ سالانہ دس روپے۔

غیب و شہود	مترجمہ سید نذیر نیازی	۳—۴—۰
حکمتِ قرآن	مترجمہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم	۱—۰—۰
تعارف جدید سیاسی نظریہ	مترجمہ عبدالمجید سالک	۲—۱۲—۰
فلسفۂ شریعت	مترجمہ شیخ عنایت اللہ	۵—۰—۰
فلسفۂ جدید	مترجمہ آشکار حسین	۲—۰—۰
نظامِ معاشرہ اور تعلیم	مترجمہ عبدالمجید سالک	۴—۰—۰
فلسفہ ہند و یونان	مترجمہ شفیق عہدی پوری	۳—۰—۰

ملنے کا پتہ:۔ سکرٹری بزمِ اقبال و مجلس ترقی ادب۔ کلب روڈ۔ لاہور

The intricate problems that face the age require a fresh approach——
An approach based on the
IDEOLOGY OF ISLAM

BUT

HOW CAN THE ABIDING VALUES OF ISLAM OPERATE IN THE MODERN CONTEXT?

FOR AN ANSWER TO THIS QUESTION

READ
THE
ISLAMIC THOUGHT

★ A two-monthly Journal devoted to Islamic Research.

★★ Which seeks to interpret the message and principles of Islam in all aspects of life, social, cultural, economic, political in the idiom of the age

WRITE TO THE:
MANAGER ISLAMIC THOUGHT,
RABIA MANZIL. BADAR BAGH: ALIGARH. (INDIA)